

کر لیتا۔

آج کا کارکن باتیں تو بہت سی کہتا ہے، مگر وہ ان کے سامنے استدلال پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس نے اس طرح مطالعہ نہیں کیا ہے جیسے شروع میں مولانا مودودیؒ نے ہر کارکن سے چاہا تھا۔ کاشکہ اس پہلو سے آج کی عدوی پھیلاؤ رکھنے والی تحریک ایسی کمزوری کو نشوونما نہ پاتے دے۔

مولانا مودودیؒ نے اسلامی نظام حیات کے ایک ایک اہم گوشے کا تفصیلی خاکہ کتاب وسنت سے اخذ کر کے دکھا دیا کہ کس طرح جدید دور کے تمام مسائل کو بہترین طریقہ میں حل کرنے کا اہتمام موجود ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اسلام کو محض سلوگن سمجھ کر کام نہ کیا جائے اور لوگوں سے ایک ایسی چیز کا گول مول وعدہ نہ کیا جائے جس کی تشکیل و تکمیل کا وقت آئے تو سرے سے کوئی خاکہ ہی موجود نہ ہو۔

مولانا مودودیؒ کے متعلق ایک بات بہت اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ وہ محض سیاسی کھیل تماشے کے آدمی نہ تھے، بلکہ روحانی پہلو سے ان کا خاص مقام تھا۔ اس کا علم دو صورتوں میں خاص خاص لوگوں کو ہو سکا۔ ایک یہ کہ مصیبت زدہ اور ضرورت مند انسانوں کے سامنے ہمیشہ اچھا سلوک کرتے رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے خاص اوقات تنہائی میں وہ ذکر و دعا اور مطالعہ قرآن و حدیث میں مصروف رہتے۔ ان کی روحانی تجلیات کا عکس سچے اہل ذوق ان کی بعض نثریوں میں پاسکتے ہیں۔ صرف ان کی دعائیں (جو کبھی کبھی اشارات میں آئیں) پڑھ لینے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے تعلقات "ادھر" کیسے تھے!

چند دوستوں نے ایک بار بل کر ایک جامع کتاب بڑی محنت سے تیار کی جس کا نام تھا "تزکیہ نفس" اور اس میں مولانا مودودیؒ ہی کے اشارات تھے، باعباراٹ۔ کس محنت سے ہم نے یہ کام مولانا کی نگرانی میں کیا اور مولانا نے خود رہنمائی بھی دی اور اس کوشش کو پسند بھی کیا۔ کچھ نہ پوچھیے کہ کس طرح یہ مسودہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا اور دست بردست

ہوتا ہوا کہاں پہنچا — پھر کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ایسی کوئی چیز تھی بھی یا نہیں۔
یہ روحانی قوت ہی تھی جس کے بل پر کبھی وہ ایسی باتیں ہم سے کیا کرتے تھے کہ یہ لوگ
د حکومت، میرے ساتھ اس طرح کی حسرتیں نہیں کر سکتے۔ ایسی روحانیت کے جلوے
آپ پچانسوی کی کوٹھڑی (۱۹۵۳ء) میں دیکھتے ہیں۔ اور اسی کی مارہے جس کا نشانہ ہر
وہ ظالم بنا جس نے مولانا کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ زیادتی کرنے والا بہت بُرے حالات
کا شکار ہوا۔

۷ دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

جب کبھی کوئی خاص تحریک چل رہی ہوتی، کوئی ملک گیر سرگرمی کسی بھی جانب سے موجود
ہوتی، کبھی رویتِ ہلال وغیرہ کی اختلافی صورت زیر بحث ہوتی تو مولانا خود دفتر یا براہِ مد
یا لان میں دن یا رات کو بیٹھ جاتے اور اہلِ دفتر میں سے جو بھی موجود ہوتا اُسے کہتے کہ
کراچی، فیصل آباد، راولپنڈی، ملتان، پشاور وغیرہ — فون کر کے پوچھو کہ معاملہ
کیا رہا۔ پھر یہ سلسلہ جگہ جگہ چلتا، یہاں تک کہ مولانا کے پاس اتنی جامع معلومات ہوتیں کہ
نہ صرف وہ مختلف دریافت کنندگان کو بتاتے بلکہ ان معلومات کی بنیاد پر جب کوئی بیان مرتب
کرتے تو وہ بہت مؤثر ہوتا۔ جب کبھی انتخابات ہوتے تب بھی ایسا ہوتا۔

مجھے ایسے کئی مواقع یاد ہیں۔ خصوصاً ایک وہ تھا جب ایوب خاں کے دور میں جماعتوں
پر سے پابندی ختم کی گئی تو مولانا نے باہر کی تمام جماعتوں کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اجازت کے
آغاز سے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر دفتر اور جملہ نظام کو فوراً بحال کر دیں۔ پھر اس کے

۸ لہ پُرانی داستان ہے کہ کنویں میں مقید شہزادے سے اسمِ اعظم جن لے اڑے
اور دستِ بدست وہ آگے پہنچ گیا — وہی ہمارے ساتھ ہوا۔ شہزادے نے تو
ایک چن کو بیل کی شکل میں پکڑ لیا تھا، ہمیں تو نہ کوئی چن ملا، نہ آدمی، نہ بیل!

متعلق ہر جگہ سے مولانا نے معلومات لیں کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا بیان آگیا کہ ہم نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام ملک میں اپنا جماعتی وجود اور نظام بحال کر دیا ہے۔

مولانا کے لیے یہ ایک عطیہ خداوندی تھا کہ جب کبھی کوئی بیان دینے تو ایک طرف حکومت یا کسی مخالف قوت کو ضروری جواب مل جاتا (یا اس پر تنقید ہو جاتی) اور دوسری طرف کارکنوں کے چہرے تمنا اٹھتے، جیسے کہ کوئی گمشدہ متاع مل گئی ہو۔ دراصل کارکن جن اشکالات میں اُلجھے ہوئے ہوتے اور جن بحثوں سے گزرے ہوتے اور ایک طرف مخالفین کی طرف سے طعن و تشنیع کا سلسلہ ہوتا اور دوسری طرف اپنیوں کا داخلی اضطراب۔ بس اس بھڑکتی آگ پر پانی پڑ جاتا۔

یہ کوئی پیری کی کرامت یا سیاسی ہینا ٹرم نہیں تھا، بلکہ مولانا مودودیؒ جب کبھی کسی مسئلے پر برسرِ عام اظہار رائے کرتے تو ایک تو تخلیقی ذہن سے قدرت کی راہ نکالتے دوسری بات ایسے گھٹے ہوئے انداز سے کہتے اور ایسی پکی زمین استدلال پر پاؤں رکھ کے کھردر ہوتے کہ بالکل اسی طرح کارکن یہ محسوس کرتا کہ اب وہ بھی اپنے بیگانوں کے سامنے دو ٹوک بات کر سکتا ہے، استدلال کی مضبوط سطح پر کھڑا ہے۔ اور وہ اپنا سر بلند رکھ کر آگے چل سکتا ہے۔ مولانا مودودیؒ اپنی بیانیوں میں طرح طرح کے متفرق شاخسانے پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ”کچھ یوں بھی اور کچھ یوں بھی“ والی بات ہوتی تو لوگوں کو کبھی اطمینان نہ ہوتا۔ یا محض بطور امکان سوچے کہ پالیسیوں کی حالت جب بھی یہ ہو کہ کبھی وہ تیز بخار کی نبض کی طرح ہوں اور کبھی قلتِ ضغطہ دہمی کی طرح سے مریل، اور ایسی کئی کئی کیفیتیں پالیسی کی ایک قرارداد یا ایک بیان میں پائی جائیں تو کارکن کا شعور تو ڈانواں ڈول ہی رہے گا۔ مثلاً یاد کیجیے، دورِ ایوبی کے اس اعلان کو یہی کہ اگر کنونشن لیگ کسی فرشتے کو بھی کھڑا کرے گی تو ہم اسے ووٹ نہیں دیں گے۔ اس ذرا سے قول پر حکومت کے تیوروں سے جھڑتی جنگاریوں سے جیب و دامن کو جلوایا، مگر کسی مرحلے پر بھی اعترافِ گناہ اور

اس پر اظہارِ ندامت کی لپستی نمودار نہ ہوئی۔ اور اس چیز نے کارکنوں کے دماغ بھی بلند کر دیئے۔

یہ بات مولانا نے پوہتی لیڈری کی ترنگ میں نہیں کہہ دی تھی۔ وہ اپنی جماعت کے قریبی حلقوں اور عوامی دائروں میں ایوب صاحب اور کنونشن لیگ کے متعلق پائے جانے والے ایسے اثرات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے تحریکی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ اہل جماعت کی مکروہ و معضوب چیز کی طرف نہ جایا جائے۔ ورنہ کارکن بظاہر دوسری طرح کے حکم کو بھی سر آنکھوں پر لگائے پھر سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کا سر بھی چکرا رہتا ہے اور آنکھیں بھی نمناک ہو رہی ہوتی ہیں۔

اپنے سے بعد والے ادوار کے لیے میں کہتا ہوں کہ خود بیانات کا رنگ تسلسل بھی دیکھنے کا ہوتا ہے۔ آج بات آسمان کی، کل زمین کی، آج رُخ مشرق کا، کل مغرب کا۔ آج پوری گرما گرمی، کل حد سے زیادہ نرمی۔ ایک دن بڑی مضبوط اصول پسندی، دوسرے دن سادہ مصلحت کا راگ۔ ایک دن دینی اسپرٹ سے باتیں۔ دوسرے دن تمام تر سیاسی اندازِ نکل۔ اگر تمام بیانات میں ایک مشترک مرکزی رُوح موجود نہ رہے، دین ہمیشہ جلوہ گر نہ رہے،

۱۔ شخصی اور خاندانی اور قومی غیرت تو معروف عام ہے۔ ایک غیرت تخریکِ اسلامی کی غیرت بھی ہوتی ہے۔ مولانا نے ایک بار تحریکی غیرت کی بنا پر جس کسی کو نظر انداز کیا۔ پھر اسے کبھی اپنائیت کے دائرے میں نہیں لیا۔ اور کبھی اس سے دین یا تحریک یا جماعت یا اپنی ذات کے لیے کسی طرح کی خدمت نہیں لی۔ مجھے ایک زمانے میں کمیونسٹ اجلاسوں میں جمہوریت کے لیے تعاون کرنے کو بھیجتے رہے۔ پھر میں نے ایک بار کی جب تفصیلی رپورٹ دی کہ کس طرح دس پندرہ مصنوعی تنظیموں کے نمائندوں کے ووٹوں کے ذریعے ہمیں امیر سے سامنے کوٹی اور صاحب بھی تھے، نہایت درست بات پر ناکام کر دیا تو مولانا نے ان سے ساوا رابطہ ختم کر دیا اور پھر کبھی قائم نہیں کیا۔ معلوم نہیں کہ آج ان کی پیپلز پارٹی کے متعلق کیا رائے ہوتی۔

اصول ہمیشہ برتر نہ رہیں تو روز روز کی ادلا بدلی ارکان اور کارکنوں کے ذہنوں کو سخت پرانگندہ، مضطرب اور معترض بنا دیتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کر آئندہ کی لیڈرشپ مولانا کے بیانات اور پالیسی کے فیصلوں اور قراردادوں کو نکال کر ایک ایک لفظ کو بغور پڑھے اور اپنے لیے نتائج و اسباق اخذ کرے۔

مولانا موڈودی کے لٹریچر کو بغور پڑھیں یا ان کے عملی نقشہ لائے کار کو دیکھیں، یہ بات بہت صاف ہو کر سامنے آتی ہے کہ اصلاح و انقلاب کا سارا دار و مدار مولانا کے نزدیک بنیادی اسلامی دعوت کے فروغ پر تھا۔ اور اس اہم کام کے لیے وہ ہر مرحلے میں اور ہر جہم کے دوران یہ چاہتے تھے کہ کارکن لوگوں سے بالمشافہ رابطے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ عام گفتگو بھی کریں، اعتراضات کو سنیں، جواباً دلائل دیں، جہاں ضرورت ہو لٹریچر بھی پیش کریں۔ ایک گفتگو کے بعد اس سلسلے کو آگے جاری رکھیں۔ متاثر ہو جانے والوں کے ذریعے ان کے حلقے کے نئے لوگوں سے تعلقات شروع کریں۔ سامعہ کے سامعہ لوگوں سے محبت بھی کریں۔ غریبوں کو سہارا دیں، علاج معالجے، تعلیم اور دوسرے پریشان کن مسائل میں ان کی مدد کریں۔ شعبہ خدمتِ خلق کام کر رہے ہو تو وہ اپنی جگہ کرتا رہے، مردوں اور خواتین کے حلقہ ہائے درس قائم ہوں وہ بھی فیض پھیلاتے رہیں۔ کوئی اخبار، رسالہ شائع ہو کر پھیلتا ہو تو وہ بھی اثر ڈالتا رہے، مزدوروں، طلبہ اور محلہ دار تنظیموں اور مصالحتی عدالتوں کے ذریعے اسلام کی روشنی کو جتنا عام کیا جاسکتا ہو، عام کیا جائے۔ جلسے اور مظاہرے ہوں تو گروہ مزید برآں ایک طرح کا کوشش ہیں۔

اصل کام بنیادی دعوت کا ہے جو رابطہ عام کے ذریعے ہونا چاہیے۔

اساسی نظریے کے بعد طریق کار کے تمام اجزاء میں سے اہم ترین جزو یہی بنیادی دعوت کا جزو ہے، جسے مولانا نے اپنے فکری اور تحریکی تر کے میں ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ یہ کام کما حقہ نہ ہو تو نہ انقلاب کامیاب ہو سکتا ہے، نہ انتخاب، اس اصل کام

ہیں اگر کمی رہے تو آپ نہ تو قوت کے مصنوعی مظاہروں سے اسے پورا کر سکتے ہیں ، نہ بیاتوں اور انٹرویوز کے ذریعے اور نہ کمزور اساس کے وقتی محاذوں اور اتحادوں کے ذریعے ۔

خدا تعالیٰ ہمیں مولانا مودودیؒ کی ساری تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کی عمومی توفیق کے ساتھ اساسی دعوت کے تقاضے کو ان کے منشا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق دے ۔ اور ان کا منشا اس بارے میں وہی ہے جو کتاب و سنت کا ہے ۔

یہی اساسی دعوت اور رابطہ عام کا سلسلہ اپنے اخلاق و کردار کی تعبیر اور اس کی حفاظت میں مدد دیتا ہے ۔ اسلامی تحریک کی ساری نتیجہ خیزی اخلاقی علو پر مبنی ہے ، جن لوگوں کی اخلاقی ساکھ گر جائے ، پھر وہ اسلامی انقلاب تو کیا لائیں گے ، اندیشہ ہے کہ کسی حادثے کا جھاڑو انہیں تاریخ کے آنگن سے کوڑے کی طرح باہر نہ اٹھا سکیے ۔

مولانا کی بات یاد ہوگی کہ اس ٹکسال کے سکوں پر محض اشرفی کی مہر لگی ہونا کافی نہیں ، بلکہ دھات بھی خالص سونا ہونی چاہیے ۔

کیا ہمارے کرداروں کے سکوں کی دھات خالص سونا ہے ؟ اگر اس میں کچھ کھوٹ میل شامل ہو گیا تو بھٹیاں اور کھٹیاں اور کسوٹیاں موجود ہیں ، اپنی اپنی صفائی اور اپنے اپنے خالص پن کی فکر کیجیے ۔

وہ شخص کیا کام کرنا چاہتا تھا ؟
وہ کیسے کہ دار کے لوگ اپنے گم و جمع کرنا چاہتا تھا ؟
وہ کس طرح کی تبدیلی چاہتا تھا ؟
وہ جماعت کو کتنا باوقار رکھنا چاہتا تھا ؟

وہ محض سیاسی تنگ و تناز چاہتا تھا یا سیاست برائے انقلاب کا علمبردار تھا؟
وہ اساسی دعوت اور بنیادی رابطوں اور اخلاقی پاکیزگی کو کتنا اہم قرار دیتا تھا؟
یہ سارے سوال اب ایسے ہیں کہ جس کی جو مرضی ہو، ویسا ہی ان کے جواب دیتا ہے
اور مولانا مودودی کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیتا ہے۔

مولانا کا وسیع لٹریچر ہر موضوع پر موجود ہے، مگر اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔
اس میں سے جب ضرورت ہو، کسی مسئلے پر کچھ اقتباسات اپنی ضرورت کے ہم لوگ نکال لیتے
ہیں۔ اور مجموعی مدعا کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ وہ تو ہم جانتے ہیں۔

اگر ہم لوگوں میں تساہل و تغافل پیدا ہو جائے تو اس سے آگے ایسا دور بھی آ سکتا
ہے کہ مولانا کے پیغام اور لٹریچر اور تحریروں کی ایسی تاویلیں کی جانے لگیں کہ الٹ نتیجے نکلیں
اور لوگ کہیں کہ زمانے کے حالات اور وقت کی ضرورتوں کے تحت یہی عمل صحیح ہے۔

ہم سب کی خواہش ہوتی چاہیے کہ مولانا مودودی نے جو لکیر ۱۹۴۱ء سے کھینچ کر ۱۹۶۹ء
تک پہنچائی تھی۔ اس مستقیم لکیر کو آگے بڑھایا جاتا رہے اور پیچ و خم پیدا کر کے اس لکیر کو
متحنی لکیر بنا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ مولانا سید ابوالاعلیٰ کی قبر مبارک کو نور سے بھر دے اور ان کی روح پر رحمتوں
کی شعاعیں برسائے۔ جنہوں نے ہمیں دین پاک کا ایسا صحیح شعور دیا کہ ہم تخریب اسلامی کے
علمبردار بن سکیں۔